پرانا نوکر

شیریں نیازی

ٹیچرس کالونی، ریور سائڈ، بھرکنڈہ، ضلع رام گڑھ (جھارکھنڈ)، موبائل: 9234033364

اچھّن میاں جب فارن سے اپنی تعلیم مکمل کرکے لوٹے تو ان کے استقبال کے لیے لوگوں کا ایک جم غفیر ایئر پورٹ پر جمع ہو گیا تھا۔ ہونے کی وجہ بھی تھی۔ وہ ایک مقامی نیتا جی کے اکلوتے بیٹے تھے۔

جہاز کی سیڑھیوں سے اُترتے اُترتے وہ پھولوں کے بُکے اور بہاروں سے لد گئے یعنی کہ لادیے گئے۔ پڑھائی میں اچھے تھے۔ بہت سارے میڈل اور سرٹیفکیٹ ساتھ لائے تھے۔ ماں باپ کا خوش ہونا لازمی ہی تھا۔

لیکن اچھّن کی نظریں بے چین اور کسی کی متلاشی نظر آ رہی تھیں۔ ہر کسی کے استقبالیہ جوش وخروش کا بے دلی سے جواب دیتے اِدھر اُدھر تاکتے وہ دھیرے دھیرے قدم بڑھائے جا رہے تھے۔

مُنیر خاں اس بھیڑ میں سب سے پیچھے رہ گئے تھے جب آگے بڑھنا چاہا، کسی کا دھکّا کھا کر پیچھے ہو گئے۔ بوڑھے اور کمزور منیر خاں اس گھر کے پرانے نوکر تھے۔ انھوں نے نہ صرف اچھّن کو بلکہ نیتا جی کو بھی گود کھلایا تھا اور انھیں اس گھر میں ہر اچھے بُرے پر اپنی رائے دینے کا بھی حق ملا ہوا تھا اور یہ حق انھیں دادی امّاں کی طرف سے ملا تھا۔

اچھّن کی بے چین نظریں شاید انہی کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ دھیرے دھیرے لوگ ہٹنے لگے تو کہیں بیچ میں منیر خاں کی ہری پگڑی کی کلغی کی معمولی سی جھلک اچھّن کی بے چین نگاہوں سے ٹکرائی تو وہ جیسے جی اُٹھے.....

''مُنیر ..... چاچا..... مُنیر ..... چاچا..... اِدھر آیئے جلدی، لیکن بہت کوششوں کے بعد بھی وہ جلدی ان تک پہنچ نہ سکے۔ چھوٹا سا کمزور سا بوڑھا جسم ان جوان ہٹے کٹے لوگوں کو دھکیل کر آگے نہیں بڑھ سکتا تھا۔ اوپر سے یہ بڑے بڑے صاحب لوگوں کے سگے سپاٹے۔ ان کی نظر میں منیر خاں گھر کے ایک پرانے ملازم ہی تو تھے۔ وفادار، ایماندار اور پیار کرنے والے۔ ان کے خیال میں نوکروں کو ایسا ہی ہونا چاہیے۔ کیونکہ وہ ان لوگوں کا نمک کھاتے ہیں۔ ان کا اپنا کوئی وجود نہیں ہوتا۔ چند روپیوں کے عوض ان کی پوری عمر ان کی ہر سانس ان کے مالک کی ملکیت بن جاتی ہے۔ عام طور پر لوگ شاید ایسا ہی سوچا کرتے ہیں۔

لیکن اچھّن کے لیے منیر چاچا ان کے نوکر نہیں بلکہ ایک اچھے دوست کی حیثیت رکھتے تھے۔ تین سالوں کے بیچ انھیں اپنا اکیلا پن بہت کھلا تھا۔ بہت بار روئے بھی تھے۔ ہر دُکھ میں انھیں ہی یاد آیا کرتے۔ ہر سُکھ میں اپنی خوشی شیئر کرنے کے لیے انہی منیر خاں کی کمی محسوس ہوا کرتی تھی۔ چاچا اپنی نیتا گری کی مصروفیت میں اُلجھے رہا کرتے اور ممّی ناری سمیتی، NGO اور کلب پروگرام میں مصروف رہا کرتی تھیں۔ ایسے میں منیر چاچا کے سوا ان کا ساتھی، دوست، ہمدم اور کون ہوتا؟

منیر چاچا کی پگڑی کی ہلکی سی جھلک کیا دکھائی دی کہ اچھّن جیسے جی اُٹھا۔ اُس کے چہرے چمک آ گئی۔

منیر چاچا کے قریب آتے ہی وہ دوڑ کر ان کے گلے میں جھول گیا۔ بہت یاد آتی تھی چاچا، مگر آپ نے تو کبھی فون تک نہیں کیا.....وہ بھاری آواز میں بولا۔ میں آپ کو کبھی یاد نہیں آیا؟

''تیری یاد ہی تو میری زندگی تھی ببوا۔ پھر میں جاہل موبائل چلانا کیا جانوں۔ میرے لیے تو میری نماز ہی تیری یاد کا ذریعہ بنی رہی۔ ہر پل ہر لمحہ تیرے لیے دعائیں کرتا رہا اور تو کامیاب ہو کر لوٹ آیا۔ شکر ہے کوئی میم صاحب ساتھ نہیں لایا۔ ورنہ.....

''لیکن ایک چیز میرے ساتھ آئی ہے آیئے آپ کو دکھا دوں۔''

اس نے راستے بھر مجھے بہت پریشان کیا۔ اب آپ ہی اسے سنبھال لیجیے۔

اس چیز کو دیکھتے ہی منیر خاں کے ہوش اُڑ گئے۔ اب اسے کون سنبھالے گا؟ وہ تھا تو بڑا خوب صورت بھولا بھالا۔ گول مٹول چھوٹا سا، مگر کتّے کا ایک پلّا ہی تو تھا۔ اعلیٰ نسل کا مویشی کتّا۔ کھان پان رہن سہن

سب الگ۔ منیر خاں پنج وقتہ نمازی اور یہ کتّے کی ذمّے داری۔ ناممکن سی بات تھی۔

''یہ ڈوگی مجھے میری ایک انگریز کلاس میٹ نے فرینڈ شپ ڈے پر گفٹ کیا ہے۔'' دیکھیے تو کتنا پیارا ہے۔ چاچا.......

''اے ہے تو کیا ہوا، ہے تو کتا ہی نہ، اور میں کیسے سنبھال سکتا ہوں ببوا۔'' یہ چیزیں ہمارے لیے نہیں ہوتیں۔ سنبھال لو نہ چاچا ویسے ہی جیسے آپ مجھے سنبھالا کرتے تھے۔ یہ بات اچھّن نے بڑی معصومیت سے کہہ ڈالی تھی اور اس کی اس آواز نے منیر خاں کو بے بس سا بنا دیا۔ ناچار کتّے کی زنجیر پکڑی اور ایک طرف چلنے لگے اس وقت انھوں نے اپنی لنگی کس کر اپنی ٹانگوں پر لپیٹ لی تھی اور بڑی مشکل سے اپنے جسم کو ڈوگی کے چھونے سے بچا بچا کر چل رہے تھے، لیکن کب تک؟ وہ بھی اس صورت میں جب کہ ڈوگی کو نہلانا دھلانا، اس کی کنگھی کرنا، کھانا کھلانا اپنی جسم پر کسی بھی طرح چھینٹیں تو پڑنی ہی تھیں۔ منیر خاں پنج وقتہ نمازی اور شروع جاڑے کا موسم۔

اچھّن کے پاپا جی نے ان کی بے چینی اور پریشانی کو کم کرنے کے لیے انھیں تسلّی دی کہ وہ جلد ہی ڈوگی کی دیکھ بھال کرنے اور ٹرینڈ کرنے کے لیے آدمی ڈھونڈھ لائیں گے۔ اب بچّہ لے ہی آیا ہے تو اسے پھینک تو نہیں دیں گے نا۔ یہ ڈوگی ہے بھی بڑا قیمتی۔

اچھّن کی انگریز کلاس میٹ کے پاپا دراصل کتوں کا ہی بزنس کرتے تھے، ان کی بریڈنگ کی جاتی تھی۔ طرح طرح کے کتّے ان کے ہاں موجود تھے۔ چھوٹے چھوٹے پلّوں کی بکری بھی تیس چالیس، پچاس ہزار میں ہوا کرتی تھی اور اچھّن کا یہ ڈوگی ایک نہ دو پورے سوا لاکھ کا تھا۔ اچھّن نے اپنی دوست کی زبانی کئی قسم کے نام جانے تھے اور آکر اپنے منیر چاچا کو سمجھانے کی کوشش کی تھی مثلاً۔ انکائر وپورس، پیرا سورا پس، سورو پوسائڈ ریس، پٹ بال، چیوچیانگ، ہاؤنڈ جرمن شیفرڈ اور اوبرائڈ دونوں کی بریڈنگ سے تیار شدہ ایک نئی نسل۔ وغیرہ وغیرہ۔ اور یہ سب سُن کر منیر خاں چکرا سے گئے تھے۔ پرانا نوکر اور مالک کی ایسی چیزوں کی محافظت سے انکار کردے۔ ایسا کیسے ہوسکتا تھا؟ لہٰذا منیر خاں اپنی تمام تر پریشانیوں کو بالائے طاق رکھ کر اِس اُمید کے ساتھ کہ کچھ ہی دنوں کی بات ہے۔ ٹرینر آجائے گا تو ان کی جان کو چھٹکارا مل جائے گا سوچ کر جی جان سے اچھّن بابو کی امانت کو سنبھالنے میں جُٹ گئے۔ دھیرے دھیرے موسم نے رُخ بدلا۔ کڑکڑاتے جاڑوں کی آمد ہوئی، راتیں زیادہ اندھیری لمبی اور ٹھنڈی ہوگئیں۔ ایسی ٹھٹھراتی سردی میں منیر خاں کو دیر رات تک ڈوگی کے سلسلے کا سارا کام نبٹا چکنے کے بعد نہانا پڑتا تھا۔ کوئی ٹرینر اب تک نہیں آیا تھا۔ ساری رات پرانا نوکر مالک کی وفاداری میں کھانس کھانس کر بے دم ہوتا رہتا۔

لیکن ان کی اتنی محنت اتنی قربانی کسی کام نہ آئی۔ موسم بدلا تو اچانک ہی ڈوگی نے کھانا پینا کم کردیا اور چند ہی دنوں میں اس کا پیٹ سٹ گیا، پسلیاں دکھنے لگیں۔ منھ سے عجیب سی بو آنے لگی۔ بڑے بڑے ڈوگ ایکسپرٹ بلائے گئے۔ ساٹھ ستّر ہزار ڈوگی کے علاج پر خرچ ہونے کے باوجود اس کی حالت گرتی ہی گئی۔ اُدھر اسّی سالہ منیر خاں کے سینے میں بھی ٹھنڈ بری طرح جکڑ چکی تھی اور وہ بھی لگ بھگ بستر سے جالگے تھے۔ اچھّن اپنے ڈوگی کی ایسی حالت دیکھ کر اکثر رو دیا کرتے۔ منیر کی تکلیف بھی انھیں کچوٹتی رہتی۔

اور پھر ہر طرح کی جانچ کے بعد ڈاکٹروں نے فیصلہ سنایا کہ ''ڈوگی اگر اسی طرح پڑا رہا تو اس کی بیماری سے سارے گھر میں انفیکشن پھیل سکتا ہے۔ لہٰذا جس طرح اونٹ اور گھوڑوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ کھروں میں زخم لگ جانے کے بعد وہ کسی کام کے نہیں رہ جاتے اور انھیں بسا اوقات گولی مارنی پڑتی ہے۔ ایسا ہی اسے۔ یعنی کہ اسے مارنے کے لیے انجکشن لگانا پڑے گا۔ اس کے سوا اور کوئی راستہ نہیں بچا۔'' انجکشن کی قیمت ۲۵ ہزار روپے ہے۔ ڈاکٹر نے کہا۔

سننے میں آیا ہے کہ جب کتّے روتے ہیں تو کسی نہ کسی کی موت یقینی ہے۔ کوئی ان باتوں پر یقین کرتا ہے کوئی نہیں کرتا، لیکن .... کچھ واقعات ان دنت کتھاؤں پر وشواس کرنے کو مجبور کردیتے ہیں۔

وہ بڑی بھیانک رات تھی جب ڈوگی کے رونے کی ایسی آواز گونجی کہ سارا محلّہ کانپ اُٹھا۔ اس کی آواز دلوں کو بھید رہی تھی۔ رونے کی ایسی آوازیں اب تک کسی نے نہیں سنی تھیں۔ لگتا تھا ساری زمین، سارا آسمان لرز رہا ہے۔

ڈوگی کے جنازے کے پیچھے ایک جم غفیر چل رہا تھا۔ سب کی آنکھیں چھل چھل ہو رہی تھیں۔

اس سے کچھ ہی فاصلے پر آٹھ کندھوں پر ایک اور جنازہ قبرستان کی طرف لے جایا جارہا تھا اور یہ آٹھواں کندھا اچھّن مرزا کا تھا۔

کون جانے ڈوگی نے اس رات کس کا ماتم کیا تھا۔ خود اپنا.... یا ایک پرانے نوکر کا؟

○○

○○